شرک فی الذّات

اب میں اللہ کا نام لے کر ''شرک فی الذات'' کی بحث شروع کر رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ بدترین' عریاں ترین' گھناؤنا ترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین شرک ہے۔ دنیا میں اس شرک کی دو صورتیں رائج رہی ہیں۔ ایک کو مذہبی نوعیت کا شرک کہا جا سکتا ہے اور ایک کو فلسفیانہ نوعیت کا شرک۔ بلکہ صحیح تر تعبیر یہ ہو گی کہ پہلا شرک وہ ہے جو اُن قوموں میں پیدا ہوا جو اپنے آپ کو رسولوں سے منسوب کرتی ہیں اور آسمانی ہدایت پر یقین رکھتی ہیں۔ اور دوسرا شرک وہ ہے جو اُن قوموں میں پیدا ہوا کہ جن کے مذاہب کی اصل حقیقت فلسفیانہ ہے' کچھ حکماء اور فلاسفہ کے فکر اور سوچ پر اُن کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔

اب پہلی نوعیت کے شرک کو لیجیے! یہ ہے کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی قرار دینا۔ ظاہر بات ہے کہ بیٹا یا بیٹی تو ہم جنس اور ہم نوع ہوئے! جیسے مغل کا بیٹا مغل ہے' انسان کا بیٹا انسان ہے اور گھوڑے کا بیٹا گھوڑا وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ یہ نوع میں' جنس میں' مرتبہ میں' غرض ہر اعتبار سے بالکل برابری اور کفو والا معاملہ ہے' اور یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے شرک پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ اور یہ کس قدر قابل تعجب بات اور ستم ظریفی ہے کہ اس نوع کے شرک میں مبتلا وہ لوگ ہوئے جو نبیوں اور رسولوں کے ماننے والے ہیں' جو جلیل القدر پیغمبروں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے ہیں' آسمانی ہدایت کا دم بھرنے والے اور اللہ کی کتابوں کو ماننے والے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو مشرکینِ عرب تھے جو اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے اس موحّد اعظم حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام کی طرف' اور اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم حنیفی ہیں' یعنی دینِ حنیف پر ہیں' وہی دینِ حنیف جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا۔ اور ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

دوسری طرف یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' کہا' انہیں اللہ کا بیٹا مانا گیا۔ تورات کو آپ پڑھ جائیے تو معلوم ہو گا کہ وہاں شرک کی مذمت اس قدر شدت کے ساتھ آئی ہے کہ شرک کو زنا کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں بار بار آپ کو یہ تمثیل ملے گی کہ جیسے کسی شخص کی بیوی زنا کی مرتکب ہو اور اپنے شوہر سے بے وفائی کرے بالکل یہی طرزِ عمل ہے اُس شخص کا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہے اور شرک کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو اللہ کا شریک بنانے کی سزا کے طور پر ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا' اور یہی وہ ارتداد کی سزا ہے جو ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ وہاں شرک کی پاداش میں ہزاروں اسرائیلیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ لیکن اسی قوم میں پھر یہ شرک پیدا ہوا کہ انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا۔ اور یہ مرض اور گمراہی اپنی انتہا اور نقطۂ عروج کو پہنچی ہے عیسائیوں کے ہاں جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ یہودیوں میں تو صرف ایک دَور ایسا گزرا اور اُن کے کچھ مخصوص فرقے تھے جنہوں نے یہ شرک کیا' مگر مسیحیت تو کُل کی کُل اسی عقیدے پر مبنی ہے' اور انہوں نے اس معاملے میں اس درجے غلو کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو صراحت کے ساتھ اللہ کا صلبی بیٹا قرار دیا اور ان کے لیے لفظ ''وَلَد'' استعمال کیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ''اِبْن'' کے لفظ میں دو احتمالات ہیں۔ عربی زبان میں ''ابــــن'' کسی تعلق اور نسبت کو بھی ظاہر کرتا ہے' اور ضروری نہیں کہ وہ باپ اور بیٹے ہی کی نسبت ہو۔ مثلاً آپ کسی کو ''ابنُ الوقت'' کہتے ہیں تو وہ وقت کا بیٹا نہیں ہے' بلکہ اس کا بندھن اور تعلق وقت سے ہے' مرغِ بادنما ہے' ہوا ادھر کی چل رہی ہو تو اِدھر کو اُس کا رُخ ہے' اُدھر کی چل پڑے تو اُدھر کو اس کا رُخ ہو جائے گا۔ اسی طرح ''ابنُ السبیل'' کہتے ہیں راستہ چلنے والے مسافر کو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ راستے کا بیٹا ہے' بلکہ راستے کے ساتھ جڑا ہوا ہے' چلا جا رہا ہے۔ تو ''ابن'' کا لفظ ذومعنیین ہے۔

اناجیلِ اربعہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ''بیٹا'' کے معنوں میں اپنے لیے لفظ ''ابن'' استعمال کرتے تھے لیکن بطور استعارہ۔ جیسے تورات میں شرک کے لیے زنا کی تمثیل ملتی ہے کہ جیسے بیوی زنا کا ارتکاب کر کے اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی ہے' اسی طرح ایک شخص شرک کر کے اپنے ربّ سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسی طرح اس نسبت کو دیکھئے جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہے کہ باپ بھی چونکہ اپنے بیٹے کو پالتا پوستا اور پروان چڑھاتا ہے' اس کی پرورش کرتا ہے' لہٰذا اسی نسبت سے حضرت مسیحؑ نے اللہ کو مخلوق کا ربّ ہونے کی حیثیت سے آسمانی باپ اور انسانوں کو اُس کے بیٹے قرار دیا۔ اناجیل اربعہ میں یہ بات ملتی ہے کہ حضرت مسیحؑ اللہ تعالیٰ کو جہاں ''میرا آسمانی باپ'' کہتے ہیں وہاں ''تمہارا آسمانی باپ'' بھی کہتے ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہے کہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ (exclusively) اپنے ہی لیے لفظ ''ابن'' استعمال کیا ہو' بلکہ ''تمام نوعِ انسانی کا آسمانی باپ'' کہا گیا اور صرف استعارہ کے طور پر۔ لیکن عیسائیوں نے آگے بڑھ کر اس عقیدے کو جہاں پہنچایا ہے وہ لفظ ''وَلَـدٌ'' ہے۔ ''وَلَـدٌ'' کے معنی صرف صلبی اولاد کے ہیں' اور اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں۔ لفظ ''وَلَدٌ'' میں کسی استعارے یا کسی اور تعلق کا معاملہ بھی نہیں ہے۔ تو یہ جان لیجیے کہ قرآن مجید نے عیسائیوں کے بارے میں تو دونوں باتیں کہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''ابنُ اللّٰہ'' بھی قرار دیا اور ''وَلَدُ اللّٰہ'' بھی قرار دیا۔ جیسے اُن کا قول نقل ہوا: ﴿ اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ﴾ (البقرۃ:۱۱۶ والکہف:۴)۔ لیکن قرآن نے یہودیوں کے بارے میں صرف ایک الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ''ابنُ اللہ'' قرار دیا۔ اور مشرکین عرب کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

اب آپ دیکھئے' سورۃ الاخلاص' جو توحید کے موضوع پر جامع ترین سورۃ ہے' اس میں چار آیتوں میں سے پہلی دو آیتیں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢﴾ تو فلسفیانہ ہیں اور بہت بلند مفہوم کی حامل ہیں۔ لیکن آخری دو آیات جہاں آ کر مضمون سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے' وہ اسی نوع کے شرک سے متعلق ہیں اور اس کی نفی کر رہی ہیں: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣﴾ ''نہ اُس نے جنا اور نہ وہ جنا گیا''۔ تمام صلبی رشتوں سے وہ بالکل پاک ہے۔ نہ کوئی اس کا باپ ہے نہ کوئی اس کی ماں ہے' نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کی بیٹی ہے۔ اور پھر اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا' جو نتیجہ نکالا گیا' وہ ہے: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤﴾ ''اور اس کا کفو کوئی نہیں ہے''۔ اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے' اس کی برابری کا کوئی نہیں ہے' اس کا ہم پلہ کوئی نہیں ہے' اس کا ہم جنس کوئی نہیں ہے اور اس کی نوع کا کوئی نہیں ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت جو شرک کے موضوع پر بڑی جامع آیت ہے' جس میں شرک کی نفی کے چار اسلوب اختیار کیے گئے' اس میں سب سے پہلا اسلوب یہی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا......﴾ ''اور (اے نبیؐ!) کہیے کہ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا......'' سورۂ بنی اسرائیل کے فوراً بعد سورۃ الکہف شروع ہوتی ہے۔ یہ دونوں سورتیں جڑواں ہیں اور حکمت قرآنی کے دو بہت بڑے خزانے ہیں جو قرآن مجید کے بالکل وسط میں موجود ہیں۔ سورۃ الکہف کے پہلے رکوع میں ذکر ہو رہا ہے:

﴿وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝٤ مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝٥﴾

''اور (اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ پر یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ) وہ تنبیہہ کر دیں اُن کو جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا۔ ان کے پاس اس ضمن میں کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے آباء کے پاس۔ بہت بڑی بات ہے جو اُن کے مُنہ سے نکلتی ہے اور وہ محض جھوٹ بکتے ہیں''۔

اس نوع کے شرک پر اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کا یہ انداز اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے اگلی سورۃ' سورۂ مریم کے آخری رکوع میں۔ جو شخص عبارت کے تیور کو پہچانتا اور لہجے کے فرق کو جانتا ہو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں اللہ کا غیظ وغضب کس طرح بھڑکتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝٨٨ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝٨٩ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝٩٠ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝٩١ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝٩٢﴾

''انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے۔ تم ایک بڑی بھاری بات کر رہے ہو (بڑی جسارت اور بڑی ڈھٹائی کا معاملہ کر رہے ہو۔ یہ اس درجے کی جسارت اور ڈھٹائی ہے کہ) آسمان اس وجہ سے پھٹ پڑنے کو ہیں' زمین شق ہونے کو ہے اور پہاڑ ایک دھماکے کے ساتھ گر پڑنے کو ہیں' اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے بیٹا قرار دیا' حالانکہ رحمٰن کے تو یہ شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔''

ان میں سے آخری آیت بہت قابل غور ہے۔ شایانِ شان نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہ بڑی سادہ سی بات ہے' لیکن پیش پا افتادہ حقائق بسا اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اولاد کی ضرورت اصل میں اس لیے ہوتی ہے کہ کوئی ہستی خود فانی ہو۔ اگر کسی کو بقاء اور دوام حاصل ہو اور اسے دنیا میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہو تو اسے کسی اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اولاد تو بقاءِ نوع اور بقاءِ نسل کے لیے ہے۔ جو فانی ہے وہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ میری اولاد کی شکل میں میری ہستی کا ایک تسلسل برقرار رہے گا۔ اسی لیے تو وہ روتے ہیں جن کے ہاں اولاد نہیں' خاص طور پر جن کی اولادِ نرینہ نہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا نام مٹ جائے گا۔ یہی طعنہ تو دیا گیا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کو کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں' ان کا نام ختم ہو جائے گا' یہ تو ابتر ہیں' جس کے جواب میں سورۃ الکوثر نازل ہوئی:

﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝١ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝٣﴾

جبکہ اللہ تعالیٰ تو خود دائم ہے' قائم ہے' باقی ہے' الحیّ القیوم ہے' لہٰذا ظاہر بات ہے کہ یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے بھی کسی اولاد کی احتیاج ہو۔ یہ ضرورت تو اصل میں ان کے لیے ہے جو فی نفسہٖ بذاتہٖ فانی ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝٩٢﴾ ''اور رحمٰن کے تو یہ شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے''۔ سورۃ الانعام کی بڑی پیاری آیت ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ﴾ (آیت ۱۰۲)

''وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اس کی شریک زندگی (بیوی) ہی نہیں ہے؟''

اس لیے کہ اللہ کے لیے بیٹا یا بیٹی مانو گے تو پہلے اس کے لیے کوئی بیوی بھی ماننا پڑے گی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اللہ کے لیے کوئی بھی بیوی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تو کیسے اس کے اولاد ہو جائے گی؟ وہ تو ''البدیع'' ہے۔ یہاں ''بدیع'' کے دونوں مفہوم ذہن میں رکھئے۔ ایک مفہوم ہے کائنات کو عدمِ محض سے وجود بخشنے والا۔ بدیع کا دوسرا مفہوم ہے انوکھی چیز' بے مثل چیز۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی وہ شان بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ بے مثل ہے' اپنی ذات میں بالکل انوکھا ہے' اس کی کوئی بیوی نہیں' تو اس کی اولاد کہاں سے ہو جائے گی؟

اس ضمن میں قرآن مجید نے مشرکین عرب کے ذکر میں کچھ لطیف طنز بھی کیے ہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے تو بزعم خویش اللہ کو بیٹے دیے، لیکن تم نے تو کمال کیا کہ الات بھی کیں تو بیٹیاں کیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''(یہ بڑی عجیب بات ہے کہ) تمہارے ربّ نے تمہیں تو بیٹے عطا کر دیے اور خود اپنے لیے اس نے فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا؟ یقیناً تم بڑی بھاری بات اپنی زبان سے نکال رہے ہو۔'' سورۃ النجم میں فرمایا گیا: ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾﴾ ''کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بڑی ہی غیر منصفانہ ہے۔'' اس لیے کہ تم نے اسے الات بھی کی ہیں تو بیٹیاں کی ہیں۔ یہی بات سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں فرمائی گئی: ﴿اَصْطَفَى الْبَنٰتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کو چھوڑ کر (اپنے لیے) بیٹیاں اختیار کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگا رہے ہو؟''

اس ضمن میں جان لیجیے کہ گزشتہ اقوام میں سے جو قومیں بھی شرک فی الذات میں مبتلا ہوئیں ان میں سے کسی نے بھی اللہ کے لیے بیوی تسلیم نہیں کی۔ سورۃ الانعام میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ﴾ (آیت ۱۰۱)

''وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ کوئی اس کی شریکِ زندگی (بیوی) ہی نہیں ہے؟''

عیسائیت کے بارے میں یہ بات جان لیجیے کہ اگرچہ عیسائیوں میں اس شرک ''شرک فی الذات'' نے سب سے زیادہ بدترین صورت اختیار کی اور یہ شرک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا، لیکن عیسائیوں میں بھی جو دو تثلیثیں رائج رہی ہیں اُن میں پہلی تثلیث (Trinity) جو ابتداء میں زیادہ مانی جاتی تھی وہ یہ ہے:

God the Father, Mary the mother and Jesus the son.

یعنی باپ، بیٹا اور ماں تین الٰہ ہیں اور اس تثلیث میں حضرت مریم سلام علیہا ماں کے رشتے سے الوہیت میں شریک ہیں، خدا کی بیوی ہونے کی حیثیت سے نہیں! اور اس میں بڑا فرق ہے۔ اِس جدید دور میں اس تثلیث کو ماننے والے بہت کم عیسائی ہیں۔ اب جو تثلیث رائج ہے، جو نسبتاً زیادہ فلسفیانہ ہے، وہ یہ ہے:

God the Father, Jesus the son and the Holy Spirit (Ruh-ul-Qudus).

یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ اس تثلیث میں سے حضرت مریم سلام علیہا کو نکال دیا گیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اس شائبہ سے بچنے کے لیے کیا گیا جو اللہ کے لیے بیوی ہونے کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انسانی ذہن غیر شعوری طور پر اُدھر منتقل ہو سکتا تھا اور یہ انسانی ذہن کو بہت برا اور نامناسب محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو تثلیث عیسائیوں کے ہاں رائج ہے، وہ ہے ''باپ، بیٹا اور روح القدس'' کی تثلیث۔

شرک فی الذات کی دوسری صورتیں

شرک فی الذات کی جو دوسری صورتیں ہیں وہ فلسفیانہ مذاہب میں رائج رہی ہیں۔ فلسفیانہ مذاہب کی مکمل ترین اور نمایاں ترین مثالیں ہندوستان کے مذاہب ہیں۔ ہندومت اصل میں کوئی ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ بہت سے مذاہب کا مجموعہ ہے۔ ان میں وہ مذاہب بھی ہیں جو خدا کا سرے سے انکار کرتے ہیں، وہ مذاہب بھی ہیں جو شدید ترین شرک کے اندر مبتلا ہیں، اور ان کے برعکس ان میں وہ مذاہب بھی ہیں جو توحید کی بہت اونچی چوٹی پر فائز ہیں۔ اسی طرح بدھ مت بھی بظاہر احوال جیسا بھی نظر آتا ہے، ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ جین مت بھی ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ تاؤازم اور کنفیوشسزم بھی فلسفیانہ مذاہب ہیں۔ اسی طرح یہ جو ہند چینی (Indo Chinese) مذاہب ہیں، ان سب کی بنیاد فلسفہ ہے۔ اگرچہ ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے، لیکن گوتم بدھ کے بارے میں بعض محققین کا گمان ہے کہ وہ ذوالکفل تھے، کپل وستو والے، یعنی کپل کا ''پ''، ''ف'' سے بدل گیا تو ذوالکفل ہو گیا (واللہ اعلم)۔ بہرحال ان فلسفیانہ مذاہب میں شرک کی جو یہ دو صورتیں اور شکلیں بنیں ان کو جان لیجیے۔

ایک شکل وہ ہے جسے انگریزی میں Pantheism سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ''ہمہ اوست'' ہے، اگرچہ اس کو خلطِ مبحث کیا جاتا ہے عقیدہ ''وحدت الوجود'' سے، جو ہمارے ہاں کے بعض حکماء، فلاسفہ اور صوفیاء کی اکثریت کا عقیدہ ہے۔ بعض لوگ ناسمجھی میں ''ہمہ اوست'' کو وحدت الوجود کے مترادف قرار دیتے ہیں یا وحدت الوجود کو ہمہ اوست کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

شرک فی الذات کی دوسری نمایاں شکل وہ ہے جسے انگریزی میں Incarnation اور ہندی میں ''اَوتار'' کا عقیدہ کہا جاتا ہے، اور عربی کا لفظ ''حلول'' تقریباً ان دونوں صورتوں کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اب پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ ہمہ اوست یا Pantheism کیا ہے۔ یہ اصل میں فلسفۂ وجود کی ایک بحث ہے۔ ہندوستان میں بعض لوگ دو ہستیوں کو قدیم مانتے ہیں، یعنی خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم۔ ان کے خیال میں تخلیق کا عمل خدا اور مادے کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے۔ جیسے ایک بڑھئی لکڑی سے کرسی یا میز یا منبر بنا دے، تو کرسی یا میز یا منبر بنانے والا بڑھئی

بھی پہلے سے موجود تھا اور وہ لکڑی بھی پہلے سے موجود تھی جس سے یہ چیزیں بنائی گئیں۔ اسی طرح خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم ہے' اور خدا نے مادے سے یہ مختلف شکلیں بنا دیں۔ اس کو آپ ثنویت کہہ لیجیے کہ دو ہستیوں کو قدیم ماننا۔ اس کے علاوہ ایک عقیدہ اُن کا رہا جو تین اشیاء کو قدیم مانتے ہیں' یعنی خدا بھی قدیم' مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ وہ خدا اور مادے کے ساتھ روح کو بھی قدیم مانتے ہیں کہ وہ بھی ہمیشہ سے ہے۔ یہ ''تعدّدِ قدماء'' کا عقیدہ ہے کہ قدیم ہستیاں ایک سے زائد دو یا تین مان لی گئیں اور یہ بھی ایک طرح کی تثلیث ہے۔ لیکن جو نسبتاً توحید کے ماننے والے تھے' جنہوں نے نہ روح کو قدیم مانا اور نہ مادے کو' بلکہ صرف خدا کو قدیم مانتے تھے' اب انہوں نے توحید سے شرک نکال لیا۔ ان کے لیے یہ بڑا اشکال پیدا ہوا کہ پھر خدا نے اس دنیا کو کیسے بنایا؟ اس لیے کہ جب کوئی شے پہلے سے تھی ہی نہیں اور صرف وہی قدیم ہے' یعنی نہ مادہ قدیم' نہ روح قدیم تو یہ دنیا کیسے وجود میں آ گئی؟ تو اس کی ایک شکل انہوں نے یہ قرار دی اور یہ عقیدہ وجود میں آیا کہ خدا نے خود ہی اس کائنات کا روپ دھار لیا۔ جیسے برف پگھل کر پانی بن جائے تو اب برف ہی پانی ہے' یعنی برف ہی نے پانی کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس پانی کو آپ نے آگ دی تو وہ بھاپ بن گیا۔ تو اب یہ بھاپ ہی پانی ہے اور بھاپ ہی برف ہے۔ اسی طرح اُن کے خیال میں خدا نے کلیتاً یا جزواً اس کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس عقیدے کی بھی دو شکلیں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ خدا اب رہا ہی نہیں' بلکہ خدا کُل کا کُل اس کائنات کی شکل میں ڈھل گیا ہے' اب علیحدہ سے خدا کے نام سے کوئی شے نہیں۔ اور دوسری شکل یہ کہ خدا کے کسی جزو نے اس کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ یعنی اگرچہ خدا بھی موجود ہے' لیکن یہ کائنات بھی اس کا جزو ہے' یا یہ اسی کے جزو کی ایک شکل ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصورات ہیں کہ نعوذ باللہ خدا کے سر سے برہمن پیدا ہوئے' بازوؤں سے کھشتری پیدا ہوئے جو لڑنے والے ہیں' اور اس کے پاؤں سے شودر پیدا ہوئے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ تصورات اسی عقیدے کا ایک منطقی ربط ہیں۔ اس عقیدے کے فلسفیانہ پہلو پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب ہر چیز الوہیت کی حامل ہے۔ اس لیے کہ جب خدا ہی نے کائنات کا روپ دھار لیا ہے تو پھر درخت بھی خدا ہیں' سورج بھی خدا ہے' چاند بھی خدا ہے' کیڑے مکوڑے بھی خدا ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ یہ بدترین شرک ہے جو آپ کو ہندوستان کی سرزمین میں ملے گا۔

صرف خدا کو قدیم ماننے والوں میں سے بعض نے اس طرح پیدا شدہ اشکال کے ازالے کے لیے ایک دوسری شکل یہ اختیار کی کہ خدا انسانوں کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے' یعنی کسی ایک انسان میں حلول کر جاتا ہے۔ یہ اَوتار یا Incarnation کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک رام چندر جی اور کرشن جی خدا کے اوتار ہیں۔ ان کے ہاں نو اَوتار تھے۔ ایک دسواں اوتار اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں نے ان میں شامل کر لیا ہے' جس کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ بہرحال ہمہ اوست (Pantheism) اور اَوتار بن جانے یا حلول کر جانے (Incarnation) کا عقیدہ شرک فی الذات کی وہ صورت ہے جو فلسفیانہ مذاہب میں رائج ہے۔

اُمتِ محمدیہؐ پر خصوصی فضل وکرم

اب ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر ہم اُمتِ مسلمہ کا جائزہ لیں کہ اس نوع کا شرک ہمارے ہاں آیا یا نہیں۔ اور اگر آیا تو کس سطح پر اور کس حد تک۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں' اور میرا گہرا احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس اُمت پر بڑا فضل اور کرم ہوا کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود اس نوع کا کوئی عقیدہ مسلمانوں کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند عقائد کی فہرست میں موجود نہیں ہے۔ یہ اللہ کا بڑا فضل اور ایک قسم کا معجزہ ہے۔ حالانکہ اس اُمت کو جو عقیدت اور محبت رہی ہے اپنے رسول ﷺ سے اس کا پاسنگ بھی نہیں ہے وہ محبت اور عقیدت اور وہ جاں نثاری جو کسی دوسرے رسول کے اُمتیوں کو اپنے رسول کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کو خدا کا بیٹا یا خدا نہیں بنایا گیا۔ عوام کالانعام کے ہاں' واعظوں اور نعت گوؤں کے ہاں اور اُن شاعروں کے ہاں جو ﴿فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ﴾ کا نقشہ پیش کر رہے ہوں' اس قسم کے اشارات اور کنائے مل جاتے ہیں اور یہ صرف ایہام کی حد تک ہے۔ ''ایہام'' کا مطلب ہے کہ بات صاف اور واضح نہ کی جائے کہ جس پر گرفت ہو' لیکن یہ کہ سامع کے ذہن میں ایک وہم اور ایک خیال ابھار دیا جائے۔ اس نوعیت کی باتیں شاعروں' واعظوں اور نعت گوؤں نے کی ہیں جن کے شرکیہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مثلاً یہ شعر کہ: ؎

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اب آپ دیکھئے کہ اس میں اور اوتار کے عقیدے میں کیا فرق ہے؟ لیکن ذہن میں رکھیے کہ یہ ایک شاعر کی مبالغہ آرائی ہے۔ یہ اس درجے کی چیزیں اور اس طرح کے استعارے ہیں جن سے شاعری کی دکان چلتی ہے۔ اس طرح کا ایک اور شعر سننے کو ملا: ؎

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر
بغیر عین کا اِک عرب ہم نے دیکھا!

اب لفظ ''عرب'' میں سے ''عین'' نکال دیجیے تو ''رب'' رہ جائے گا۔ یعنی رسولِ عربی ﷺ اصل میں ربّ ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ شعر میں بات واضح نہیں کی گئی اور آپ گرفت کریں گے تو کہا جائے گا ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ کہ ایک وہم اور خیال پیدا کر دیا' ذہن کو اُدھر موڑ دیا' اور سننے والوں میں جو زیادہ خوش عقیدہ ہوں گے انہوں نے واہ واہ کی ہوگی اور داد

دی ہوگی۔ تو اس طرح کی باتیں جہلاء اور عوام کالانعام کے تحت الشعور کے اندر پروان چڑھتی چلی گئی ہیں' لیکن ہمارے ہاں کے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا شائبہ یا اشارہ تک نہیں ہے۔ اور یہ میرے نزدیک معجزہ ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا اور اصل میں اس کا براہِ راست تعلق ہے ختمِ نبوت کے ساتھ۔ دراصل یہ تحفظ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو عطا فرمایا کہ آپؐ اس غلو کا ہدف اور نشانہ نہیں بنے۔ یہ ختم نبوت کے لوازم میں سے ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا خود ذمہ لیا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی یہ الذکر (قرآن حکیم) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ اور دوسری طرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو حفاظت عطا فرمائی کہ ان کی شخصیت مسخ نہ ہو جائے' وہ کہیں اَوتار نہ بنا دیے جائیں' وہ بھی کہیں خداؤں کی فہرست میں شامل نہ ہو جائیں' انہیں کہیں خدا کا بیٹا نہ بنا دیا جائے۔ تو یہ درحقیقت ایک تحفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ پر ہوا ہے۔ اس کا زیادہ اندازہ آپ کو اُس وقت ہوگا جب آپ اس حقیقت کو سامنے رکھیں گے کہ یہ معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

حضرت علیؓ کی نسبت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک اُمتی کی ہے' چنانچہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے کم از کم ایک درجہ تو نیچے لائیں گے۔ ویسے تو اہل سنت کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کے بعد درجہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہے' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ لیکن اُمتیوں کو ایک ہی کیٹیگری شمار کرنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے کم از کم ایک درجہ تو نیچے ہیں' لیکن آپ سوچیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہنے والے پیدا ہو گئے' اور خدا کا بیٹا بھی نہیں بلکہ خود انہیں خدا بنا دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بدترین عقیدے کی پاداش میں زندہ آگ میں جلوایا ہے۔ یہ ایک یہودی سازش تھی اور اس سازش کو کامیاب کرنے کے لیے لوگوں نے پورے استقلال کے ساتھ جانیں دی ہیں۔ اس لیے کہ قربانی دیے بغیر کسی بھی سازش کی آگ آگے نہیں بڑھتی۔ ہمارے ہاں جہلاء میں جو نعرہ مروّج ہے وہ ''یا علی مدد'' کا ہے ''یا محمدؐ مدد'' کا نہیں ہے۔ ''یا محمدؐ'' / ''یا رسول اللہ'' تو محض اپنے تشخص کو نمایاں کرنے کے لیے مسجدوں میں لکھنے کے کام آتا ہے' یا یہ نعرہ ایک خاص فرقے کے اجتماع یا جلسہ کے اندر لگوایا جاتا ہے' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ مسجد فلاں فرقے کی ہے اور یہ جلسہ فلاں گروہ کا ہے۔ باقی یہ کہ جو نعرہ میدان میں لگتا ہے وہ ''یا محمدؐ مدد'' کا نہیں' بلکہ ''یا علی مدد'' کا ہوتا ہے۔ تو الوہیت کا یہ معاملہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا۔

مسند احمد میں یہ حدیث موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک مشابہت پائی جاتی ہے کہ (ایک طرف) اُن سے یہود نے بغض رکھا حتیٰ کہ ان کی والدہ محترمہ پر (بدکاری کی) تہمت لگائی' اور (دوسری طرف) نصاریٰ نے ان سے انتہائی محبت کی' حتیٰ کہ انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جو اُن کا مقام نہیں''۔ یہ دو انتہائیں ہیں۔ ایک گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عقیدت میں اس قدر غالی ہو گیا کہ اس نے انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا اور ایک گروہ اُن کی دشمنی میں اس انتہا کو پہنچا کہ انہیں (معاذ اللہ) ولد الزنا قرار دیا اور اپنے بس پڑتے انہیں سولی پر چڑھا کر دم لیا۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہو کر رہا کہ حضرت علیؓ کو خدا کہنے والے بھی پیدا ہوئے اور خوارج کا وہ فرقہ بھی پیدا ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (نعوذ باللہ) کافر اور واجب القتل کہتا تھا اور انہی میں سے ایک فرد نے بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

اب آپ اس پس منظر میں دیکھئے کہ الحمد للہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو نہ تو خدا کا بیٹا کہا گیا اور نہ ہی خدا کہا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کا خصوصی تحفظ ہے کہ اس نوع کا کوئی بھی خیال ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوا۔ بدقسمتی سے شاعری اور نعت گوئی کی حد تک ایسی حرکات سرزد ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ نعت کہتے ہوئے حدود کے اندر رہنا اکثر و بیشتر بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر نے بالکل صحیح بات کہی ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

چنانچہ نعت گوئی میں کچھ عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے' ہوش کا دامن ہاتھ میں رہتا نہیں۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ بڑے سے بڑے ممدوح شخص کی ممدوحیت بھی حق کو تسلیم کرنے میں اور باطل کے ابطال میں ہمارے سامنے مانع نہ ہو اور راستے کا روڑا نہ بنے۔ معصوم صرف نبی ہوتے ہیں اور نبوت ختم ہو گئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر۔ اپنی ذات میں حجت تو نبی اکرم ﷺ ہی تھے۔ باقی سب کو تو پرکھا جائے گا قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر۔ جو اِس پر صحیح اترے وہ صحیح ہے۔ کسی بھی شخص کو ہم یہ درجہ نہیں دے سکتے کہ وہ جو چاہے کہہ دے ہم اسے تسلیم کر لیں گے' بلکہ اس کی جو بات صحیح ہے وہ تسلیم کریں گے اور جو غلط ہے اس کو رد کر دیں گے۔ کسے باشد' کوئی بڑی سے بڑی ممدوح شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔

بہرحال ہمارے ہاں شاعری اور نعت گوئی کی حد تک اَوتار کے عقیدے کے خیالات موجود ہیں اور صفاتِ الٰہی میں نبی اکرم ﷺ کو اللہ کا ہم پلہ بنا دیا گیا ہے ___ یہ بحث ان شاء اللہ ''شرک فی الصفات'' کے ذیل میں تفصیل سے آئے گی ___ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' آپ کو مسلمانوں کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند علماء کے ہاں ایسی چیز نہیں ملے گی۔ اہل علم جب بات کریں گے تو ان کی بات کے اندر توازن ہوگا' اور وہ ان علمی احتیاطوں کو ملحوظ رکھ کر بات کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان ذرا سا بھی غیر محتاط ہو جائے تو وہ شرک کے دامن میں جا پہنچتا ہے۔

اسی طرح جب وحدت الوجود کا عقیدہ ہمارے ہاں شعراء کا تختۂ مشق بن گیا تو اس کی بھی جو تعبیریں عوام تک پہنچی ہیں وہ ہمہ اوست اور اُوتار والی ہیں۔ ہمہ اوست کی تعبیر ہمارے ہاں اس شعر میں ملتی ہے:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود رندِ سبو کش
خود برسرِ آں کوزہ خریدار بیامد
بشکست و رواں شد

برتن بنانے والا مٹی لے کر اس کو چکر پر چڑھاتا ہے تو ایک نئی چیز یعنی برتن وجود میں آ جاتا ہے۔ اب ویسے تو یہ تین چیزیں ہو گئیں۔ ایک خود برتن بنانے والا' دوسرا وہ برتن یا کوزہ اور تیسری چیز وہ مٹی یا گارا جس سے برتن وجود میں آیا۔ لیکن اس شعر کی رو سے اصل میں یہ تین نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی ہے۔ اب وہ برتن بنانے والا خود ہی اس کوزے میں شراب بھی پی رہا ہے۔ پھر خود ہی اس نے خریدار بن کر اس کو خریدا' اور پھر اس کو توڑا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ جو سارا تماشا ہے یہ اُس ہمہ اوست کی تعبیر ہے۔ ویسے یہ شاعری اتنی بلند ہے' تراکیب اتنی چست اور آہنگ ایسا دلکش ہے کہ آدمی جھوم جاتا ہے۔ اگلے شعر میں یہاں تک کہا گیا:

در برقعۂ جبریل بود نازلِ قرآں
آں چشمۂ وحدت
آخر بہ جہاں صورتِ آں یار برآمد
محبوبِ جہاں شد!

یعنی جبرئیل کا لبادہ بھی اُس نے خود ہی اوڑھا' قرآن کا نازل کرنے والا بھی وہ خود ہے اور آخر کار نبی اکرم ﷺ کی شکل میں وہ (خدا) دنیا میں خود ہی آ گیا' اور محبوب جہاں بن گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!)

اب دیکھئے اس میں ہمہ اوست اور اوتار دونوں طرح کے تصورات جمع ہیں۔ شاعری اگرچہ بہت پیاری اور وجد میں لانے والی ہے' لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی! اسی لیے کسی نے بڑی پیاری بات کہی ہے: ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار!'' یعنی آپ اللہ کی جتنی تعریف کر سکیں کرتے چلے جائیں' تب بھی آپ اس کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے بہت محتاط اور چوکس رہنا پڑے گا۔ کسی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی معرفت کا حق ادا کر سکے۔ اس ضمن میں لامحالہ یہی کہنا پڑے گا:

مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ

''اے ربّ! ہم نے تیری بندگی نہیں کی جتنا کہ تیری بندگی کا حق تھا اور تیری معرفت حاصل نہیں کر سکے جتنا کہ اس کا حق تھا۔''

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز میدانِ حشر میں' جب دربارِ خداوندی لگا ہوگا' حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں اُس روز اپنے ربّ کی وہ حمد کروں گا جو آج نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ حمد ہوتی ہے معرفت کی نسبت سے اور معرفت نبویؐ کسی ایک جگہ آ کر ٹھہر نہیں گئی' بلکہ اس میں ترقی ہوتی رہی' درجات بلند سے بلند تر ہوتے رہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ﴿۴﴾﴾ (الضحیٰ) ''اور ہر آنے والی ساعت آپ کے لیے ہر پہلی ساعت سے بہتر ہے''۔ تو جیسے جیسے معرفتِ خداوندی کی منازل طے ہو رہی ہیں حمد کے درجات بھی بلند ہو رہے ہیں۔ جتنا آپ ربّ کو پہچانیں گے اتنی ہی اس کی حمد کر سکیں گے! چنانچہ آپ اللہ تعالیٰ کی جتنی حمد بھی کر لیں' پھر بھی اس کی حمد ادا نہیں ہوتی' ع ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں انتہائی ہوشیار رہنا ہوگا۔ ع ''ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را!'' کے مصداق یہاں انسان کا قدم تلوار کی دھار پر ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ﴾ (النساء: ۱۷۱) ''اپنے دین میں غلو ہرگز نہ کرو''۔ یہ غلو ہی تو تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا گیا' حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا گیا۔ یہ محبت اور عقیدت کا غلو ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی مدح' تعریف اور ثناء کے بیان میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جہلاء اور عوام کالانعام سے قطع نظر ہمارے ہاں کے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں الحمد للہ اس احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

شخصیتِ محمدیؐ کے تحفظ کے اسباب

اس ضمن میں باطنی طور پر تو اصل دخل ہے حکمت خداوندی کو کہ یہ تحفظِ خصوصی ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا' لیکن اس میں دو چیزیں اور ہیں جو ظاہری اسباب میں سے ہیں۔ جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا اصل سبب تو ہے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اللہ تعالیٰ کا ذمہ' لیکن ظاہری اسباب میں یہ حفظِ قرآن کا جو معاملہ چلا' یہ اس کا ذریعہ ہے۔ یہ

قرآن صرف کتابوں ہی میں نہیں ہے‘﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ﴾(العنکبوت:٤٩) ’’بلکہ یہ کھلم کھلا آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں‘‘۔فن قراءت کی کتابیں تو بعد میں لکھی گئی ہیں۔قرآن حکیم تو ایک زبان نے دوسری زبان سے سیکھا ہے‘اور یہ ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوا ہے‘اور اب لاکھوں کی تعداد میں حفاظِ کرام موجود ہیں۔پھر رمضان المبارک اور تراویح کا نظام ہے جس میں حفظ کو تازہ کیا جاتا ہے۔تو یہ سارا سلسلہ حفاظتِ قرآن مجید کے ظاہری اسباب میں سے ہے‘جس کے باطن میں دراصل مشیتِ خداوندی کارفرما ہے۔اسی طرح نبی اکرم ﷺ کو جو تحفظ ملا ہے کہ آپؐ کے ساتھ وہ ظلم روا نہیں رکھا گیا‘ درآں حالیکہ آپؐ کے ایک اُمتی پر وہ ظلم ہو گیا‘ تو اصل میں تو یہ مشیتِ الٰہی ہے‘لیکن اس کے ظاہری اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔قرآن کریم میں جابجا یہ مضمون مختلف پیراؤں میں آیا ہے۔ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (الکھف:١١٠)

’’(اے نبیؐ!) کہیے کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا‘ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے‘‘۔

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف‘ جو دو جڑواں سورتیں ہیں‘ان میں اہل علم کے لیے ایک عجیب نکتہ ہے کہ ان دونوں کی آخری دو دو آیات فعل امر’’قُلْ‘‘ سے شروع ہوتی ہیں۔سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان ہے۔فرمایا:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾﴾

’’اور (اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا‘ نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ کوئی اس کا دوست ہو‘ اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجے کی بڑائی‘‘۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ کی شانِ تنزیہی کو خوب نمایاں کیا گیا ہے‘ مبادا کہیں اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ بلند سے گرا دیا جائے۔

اس لیے کہ شرک کی دو ہی صورتیں ہیں۔پہلی صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوقات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر خدا کے برابر بٹھا دیا جائے۔ان کے علاوہ تیسری صورت تو ممکن نہیں۔تو سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت نے شرک کی پہلی صورت کی جڑ کاٹی ہے‘ جبکہ دوسری صورت کی جڑ کاٹی ہے سورۃ الکہف کی آخری آیت نے بایں الفاظ:﴿قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (الکھف:١١٠)

یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے۔جب مشرکین عرب نے نبی اکرم ﷺ سے معجزات طلب کیے کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہمارے لیے فوراً ہی یہاں پر ایک چشمہ برآمد ہو جائے‘ یا ایک باغ تیار ہو جائے‘ یا ایک محل بن جائے‘ یا ہمیں آسمان پر چڑھ کر دکھائیں‘ تو ان سب باتوں کا یہ جواب دلوایا گیا:﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾﴾ ’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے پاک ہے میرا پروردگار‘ میں تو صرف ایک انسان ہوں‘ جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے‘‘۔تم یہ مطالبے مجھ سے تب کرتے اگر میں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہوتا۔میں نے خدائی کا دعویٰ تو نہیں کیا۔ثبوت اور دلیل طلب کی جاتی ہے دعوے کی مناسبت سے۔اگر میں نے الوہیت اور خدائی کا دعویٰ کیا ہوتا تو تمہارے مطالبے درست تھے کہ یہ کر کے دکھاؤ تو تمہیں خدا مانیں گے‘ جبکہ میں نے تو صرف ایک دعویٰ کیا ہے کہ میں ایک رسولِ بشر ہوں‘ لہٰذا مجھ سے اسی کی مناسبت سے کوئی دلیل طلب کرو۔تو پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔

یہاں میں ایک واقعہ پیش کر دوں کہ ایک بار بریلوی مکتب فکر کے ممتاز عالم دین صاحب زادہ فیض الحسن صاحب نے اپنی تقریر میں اپنے مخالفین پر بڑے لطیف پیرائے میں تنقید کی‘ جو مجھے پسند آئی۔انہوں نے اپنے ہم مسلک اور ہم مشرب لوگوں کے سامنے مخالفین کو للکار کر کہا کہ:’’کیا تم ہمیں پاگل اور جاہل سمجھتے ہو؟ کیا ہم قرآن نہیں پڑھے ہوئے یا ہم عربی نہیں جانتے؟ ہم خوب جانتے ہیں کہ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کو بشر کہا ہے۔ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ تم آپ ﷺ کی بشریت کو زیادہ نمایاں نہ کرو‘ بشر بشر کی رٹ نہ لگاؤ کہ یہ سوئے ادب ہے۔اس لیے کہ تمہارے والد کا نام اگر عبدالرحمٰن ہے تو تم اسے عبدالرحمٰن کہہ کر نہیں پکارتے‘ ابا جان کہتے ہو!‘‘ بہرحال قرآن مجید جس طرح سے نبیٔ اکرم ﷺ کی بشریت کو نمایاں کر رہا ہے تو یہ کسی حکمت کی وجہ سے ہے۔فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ کے مصداق لازماً اس کی کوئی ضرورت ہے‘ لازماً کوئی فتنہ ہے‘ جس کا سدّباب مقصود ہے۔چنانچہ اس مقصد اور حکمت کے تحت اس کو بیان کرنا ہو گا۔البتہ ضدّم ضدّا کا معاملہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

میں آپ کو اسی ضدّم ضدّا کی مثال کے طور پر نام لیے بغیر ایک دوسرے مکتب فکر کے ایک بہت بڑے عالم دین کا واقعہ سناتا ہوں۔اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے! جس کی مجھے تحسین کرنی تھی اس کا نام لے کر بات کی ہے اور جس پر تنقید کرنی ہے اس کا نام نہیں لینا چاہتا۔وہ صاحب پنجابی میں سیرت النبی ﷺ پر ملی جلی تقریر کر رہے تھے‘ جس میں تفسیر بھی تھی‘ سیرت بھی تھی اور اختلافی مسائل بھی تھے۔واقعہ یہ ہے کہ اُس اللہ کے بندے نے پوری تقریر میں صحابہ کرام ؓ میں سے کسی کے نام کے ساتھ کہیں بھی ’’حضرت‘‘ اور ’’رضی اللہ عنہ‘‘ نہیں

کہا۔ اور جب بیعت رضوان کا واقعہ سنایا تو اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں انہوں نے کہا: (اردو ترجمہ) ''ارے! عثمان زندہ ہے اور اِدھر بیعت ہو رہی ہے! تو کہاں گیا تمہارا علم الغیب؟'' یہ آگ کو ہوا دینے کا سا ایک انداز ہے اور ایک رسہ کشی کا معاملہ ہے۔ ورنہ یہ کہ ان معاملات کو ہم حل کرنے پر آئیں تو قطعاً کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو تحفظ ہوا ہے رسول اللہ ﷺ کا اس میں بہت بڑا حصہ اس کا ہے کہ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔

اسی کے تابع دوسری بات سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔ اگر کہیں ذرا سا بھی وہم پیدا ہونے کا امکان نظر آیا تو وہاں پر بھی نبیٔ اکرم ﷺ نے فوراً ٹوک دیا۔ مثلاً تعظیماً کھڑے ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ کوئی بزرگ ہستی آئے تو آپ کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ اس کی تعظیم ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے اپنے لیے اسے بھی پسند نہیں کیا، بلکہ آپؐ صحابہؓ کو اس سے سختی سے روکتے تھے۔ ایک صحابیؓ کی زبان سے گفتگو میں یہ الفاظ نکل گئے: ''مَا شَآءَ اللّٰہُ وَمَا شِئْتَ'' یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں۔ اس پر آپؐ نے فوراً ٹوک دیا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا؟)) ''کیا تم نے مجھے اللہ کا مدّ مقابل بنا دیا؟'' یہاں آپؐ نے ''نِدّ'' کا لفظ استعمال کیا جس کی جمع ''انداد'' ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُس کے مدّ مقابل بناتا ہے، اور پھر یہ لوگ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں''۔ تو نبی اکرم ﷺ نے اتنا سخت لفظ استعمال کیا کہ تم نے مجھے اللہ کا نِدّ (مدمقابل) بنا دیا؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ ان صحابیؓ کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ اُن کا یہ جملہ وہم پیدا کر سکتا تھا اور مساوات کی شکل ذہن میں آ سکتی تھی، لہٰذا آپؐ نے سختی سے ٹوک دیا۔ اس لیے کہ مشیت تو صرف اللہ کی ہے۔ آپ ﷺ کی شان تو یہ ہے کہ: ﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ج﴾ (القصص:۵۶) ''(اے نبیؐ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں (یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے)، بلکہ اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔

تیسری بات جو مَیں کرنے لگا ہوں وہ ذرا حساس (sensitive) بحث ہے۔ قرآن مجید میں نہ صرف نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو نمایاں کیا گیا بلکہ اگر کہیں آپؐ سے بتقاضائے طبع بشری معمولی سی خطا یا چوک بھی ہوئی (ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی زبان دکھتی ہے) تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ٹوکا اور گرفت فرمائی اور اس گرفت کو ہمیشہ ہمیش کے لیے قرآن مجید کا جزو بنا دیا، تا کہ تمام کلمہ گو، تمام اُمتی ہمیشہ پڑھتے رہیں کہ یہ گرفت ہوئی تھی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد ہوا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۝۱ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۝۲ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی ۝۳ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۝۵ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی ۝۶ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ۝۷ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ۝۸ وَھُوَ یَخْشٰی ۝۹ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی ۝۱۰ کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ ۝۱۲﴾

''تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا، اس لیے کہ ان کے پاس آیا ایک اندھا۔ آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیۂ نفس حاصل کرتا یا وہ نصیحت اخذ کرتا تو نصیحت اسے فائدہ پہنچاتی۔ جو شانِ استغناء کا مظاہرہ کر رہا ہے اس کی طرف آپ توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ تزکیہ حاصل نہ کرے تو آپ پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو آپ کے پاس دوڑ کر آیا اور اس کے اندر خشیت ہے تو آپ اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ پس جو چاہے اس یاددہانی کو اخذ کرے''۔

اسی طرح غزوۂ اُحد کا واقعہ ذہن میں لایئے جس پر رسول اللہ ﷺ کی گرفت ہوئی، حالانکہ آپ ﷺ میں وہ پہاڑ جیسی عزیمت تھی کہ کوہ ہمالیہ بھی جس پر رشک کرے۔ یومِ طائف میں یہ عزیمتِ محمدیؐ خوب ظاہر ہوتی ہے۔ پتھراؤ سے جسم لہولہان ہے، زید بن حارثہؓ کے سوا کوئی جاں نثار ساتھ نہیں ہے۔ اندازہ کیجیے کہ سائے کی طرح آپؐ کے ساتھ رہنے والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی سفرِ طائف میں آپؐ کے ہمراہ نہیں تھے۔ آپؐ کا استہزاء ہوا، فقرے چست کیے گئے، طائف کے تینوں رؤسا نے ایک سے ایک بڑھ کر کلیجے کو چھید دینے والے الفاظ استعمال کیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اوباشوں نے جس طرح آپؐ کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا وہ ناقابل بیان ہے۔ لیکن اُس وقت بھی جبکہ آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ اگر آپؐ چاہیں تو مَلَکُ الجبال ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دے اور طائف کے رہنے والے ان کے مابین سرمہ بن جائیں، وہ عزیمتِ محمدیؐ کوئی بددعائیہ کلمہ زبان سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ بلکہ زبانِ رحمت سے ارشاد ہوا کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے! لیکن غزوۂ اُحد میں زبان سے یہ جملہ نکل گیا: ((کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا خَضَبُوْا وَجْہَ نَبِیِّھِمْ بِالدَّمِ؟)) ''اُس قوم کو اللہ کیسے ہدایت دے گا جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگ دیا!'' حالانکہ یہ کوئی بددعا نہیں تھی کہ اے اللہ! ان کو ہدایت نہ دیجیو، بلکہ یہ ایک تبصرہ تھا۔ لیکن اس پر گرفت ہوگئی: ﴿لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ﴾ (آل عمران:۱۲۸) ''(اے نبی!) آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے (ہدایت اور ضلالت کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) وہ چاہے گا تو اُن کی توبہ قبول کرے گا اور اگر چاہے گا تو اُن پر عذاب بھیج دے گا''۔ یہ فیصلہ اے نبیؐ! آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ اپنا کام کیجیے اور ان کے انجام کو ہمارے حوالے کیجیے۔ ﴿اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ ۝۲۵ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ ۝۲۶﴾ ''یقیناً ہماری طرف ان سب کو لوٹ کر آنا ہے، پھر ہمارے ذمہ ہے ان کا حساب''۔ اور تاریخ کی اس حقیقت کو دیکھئے کہ اس پورے حادثۂ فاجعہ کا جو سب سے زیادہ ذمہ دار شخص ہو سکتا تھا، یعنی خالد بن ولید، اسی کو اللہ تعالیٰ نے لسانِ محمدیؐ سے خطاب دلوایا: ((خَالِدٌ سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ)) ''خالد تو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے''۔ عالمِ اسباب میں تو غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی فتح کو شکست میں بدل دینے والے خالد بن

ولید ہی تھے‘لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل فرما دیا۔ بہرحال قرآن مجید نے ان باتوں کو نمایاں کیا ہے تو حکمتِ بالغہ کے تحت کیا ہے۔ ایسے مقامات سے گزرتے ہوئے قاری کے دل میں یہ بات آتی ہوگی کہ اگر یہ چیزیں قرآن میں نہ ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ ہمیں ترجمہ کرتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے اور ہماری زبان لڑکھڑاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور (اے نبیؐ!) یہ لوگ تو درپے تھے اس کے کہ آپ کو بچلا دیں اس وحی سے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپ ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ لائیں‘ اور تب تو یہ لازماً آپ کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم آپ کے پاؤں جمائے نہ رکھتے تو آپ تو ان کی طرف کسی درجے میں مائل ہو ہی جاتے۔‘‘

اور اگلی آیت میں پھر اس پر تبصرہ ہوا ہے:

﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾﴾

’’اگر ایسا ہو جاتا تو ہم لازماً آپ کو دوہری سزا دیتے دنیا کی اور دوہری سزا دیتے موت کی‘ پھر آپ کو ہمارے مقابلے میں اپنے لیے کوئی مددگار (اور کوئی چھڑانے والا) نہ ملتا‘‘۔

بہرحال بتانا یہ مقصود ہے کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اُسی طرح شرک کی آمیزش سے پاک اور صاف ہے۔ آپؐ بشر ہیں اور رسول ہیں۔ آپؐ عبدہٗ بھی ہیں اور رسولہٗ بھی ہیں۔ آپؐ عبدِ کامل بھی ہیں اور رسولِ کامل بھی۔ اس شعر میں کتنی بڑی حقیقت بیان ہوئی ہے:

اَلـــــــــرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَـــــــــنَـــــــــزَّلْ
وَالْـــــــــعَبْـــــــــدُ عَبْـــــــــدٌ وَاِنْ تَـــــــــرَقّٰـــــــــی

’’ربّ ربّ ہی ہے چاہے وہ کتنا ہی نزولِ اجلال فرما لے‘ اور بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند مقام پر پہنچ جائے‘‘۔

چودہ سو برس گزرنے کے باوجود یہ امتیاز قائم ہے‘ حالانکہ اس اُمت میں اپنے نبی ﷺ کے ساتھ محبت اور عقیدت میں کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں رہی ہے۔

بہرحال یہ حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے تحت ہے‘ اور یہ لازمی نتیجہ ہے ختمِ نبوت کا۔ لیکن اس کے اسبابِ ظاہری میں سے پہلا یہ ہے کہ قرآن مجید نے نبیٔ اکرم ﷺ کی بشریت پر بہت زور دیا ہے اور اسے بہت نمایاں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اگر کہیں صحابہ کرامؓ میں کوئی ایسا رجحان دیکھا کہ جس سے کسی دیکھنے والے کو مغالطہ ہو سکتا تھا تو اس پر آپؐ نے نکیر فرمائی۔ اور تیسرے یہ کہ جہاں کہیں بھی بر بنائے طبع بشری آپ ﷺ سے کوئی خطا یا چوک ہوتی تھی‘ اگر چہ وہ جانبِ خیر ہی ہوتی تھی‘ تو اُس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت گرفت ہوتی۔ یہاں میں کسی مغالطے کے سدّ باب کے لیے وضاحت کر دوں کہ نبی کی غلطی کے لیے ’’خطا‘‘ کا لفظ موزوں ترین ہے۔ اس لیے کہ خطا میں نیت کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا سب سے نمایاں استعمال ہے ’’نشانے کا خطا ہو جانا‘‘۔ اب نشانچی کی تو نشانہ لگانے کی انتہائی کوشش ہوتی ہے‘ اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ نشانہ اِدھر اُدھر ہو‘ لیکن بعض اوقات نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس کے ارادے اور نیت سے بالکل باہر کا معاملہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ خطا میں نفسانیت نہیں ہوتی بلکہ خیر ہی کی طلب ہوتی ہے۔ یعنی نبی سے خطا ہوتی ہے تو جانبِ خیر میں ہوتی ہے‘ جانبِ شر میں نہیں ہوتی۔ سورۂ عبس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھیے کہ یہ سارا معاملہ دین کی تبلیغ کے لیے تھا‘ دین کی اقامت کے لیے راستہ نکالنا مقصود تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے چاہا کہ ان چودھریوں اور سرداروں کی طرف توجہ اور التفات کروں گا تو ان میں سے اگر ایک بھی ایمان لے آتا ہے تو وہ ہزاروں کے برابر ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے جھولی پسار پسار کر دعا کی ہے کہ پروردگار! عمرو بن ہشام یا عمر بن الخطاب میں سے ایک کو تو ضرور اسلام کی توفیق عطا فرما دے! اس لیے کہ آپؐ جانتے تھے کہ ان میں سے ایک جو ہے وہ ایک لاکھ کے برابر ہے۔ ایک ایمان لے آئے گا تو دین کو تقویت پہنچے گی۔ تو یہ سارا معاملہ محض دین کے لیے تھا‘ اس سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) کوئی اپنی ذاتی آسانی مطلوب نہیں تھی‘ کوئی اپنی ذاتی قدر و منزلت بڑھانی مقصود نہیں تھی۔ ان بڑوں کی طرف التفات اس لیے نہیں تھا کہ ان کی دولت کی طرف آپؐ کی کوئی حریصانہ نگاہ تھی‘ (معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ) بلکہ یہ دین کی بہتری کے لیے اور ان مسلمانوں کی مصلحت کے لیے تھا جو چکی کے پاٹوں میں پسے ہوئے تھے۔ آپؐ نے چاہا کہ اگر ایسے چند بااثر لوگ ایمان لے آئیں تو ان کو بھی ریلیف ملے گا‘ انہیں بھی سہارا ملے گا‘ ان کو قوت اور تقویت حاصل ہوگی۔

بہرحال قرآن نے ان چیزوں کو جس طرح نمایاں کیا اور جو سخت اندازِ خطاب برتا ہے یہ درحقیقت اس وجہ سے ہے کہ مقامِ ربوبیت اور مقامِ عبدیت میں امتیاز قائم رہے۔ اور یہ صورت حال الحمدللہ‘ ثم الحمدللہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود برقرار رہی ہے۔ باقی یہ کہ ہمارے ہاں اگر کچھ اولیاء اللہ اور صوفیاء کی عقیدت میں کچھ غلو ہوا ہے تو جان لیجیے کہ ’’ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں‘‘ کے مصداق اگر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا مقام یہ ہے جو قرآن نے بیان فرمایا تو کسی اور کا ان سے اونچا مقام کیونکر ہو جائے گا؟ کسے باشد! بڑے سے بڑے پیر‘ بڑے

سے بڑے صوفیاء اور بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا مقام بھی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسے ہے جیسے سورج کے سامنے ستارے ہوں' ان سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے ہاں جو مغالطے پھیلے ہوئے ہیں وہ محض اسی نوعیت کے ہیں جیسے میں نے بتایا' کہ جہلاء' شعراء' نعت گوؤں اور واعظوں نے اپنے غلوِ بیان میں یہ شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ بدقسمتی سے اس میں اَوتار (Incarnation) کا عقیدہ بھی آ گیا ہے اور ہمہ اوست (Pantheism) بھی آ گیا ہے اور اس میں ''بغیر عین کے اِک عرب'' سے خدا کا ایہام بھی پیدا کر دیا گیا ہے۔ آپ ان ساری چیزوں کو اسی کھاتے میں رکھیے اور اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود بھی اس اُمت مسلمہ کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند عقائد کی فہرست میں ''شرک فی الذات'' کی یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں۔ یعنی نہ تو کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا اور بیٹی قرار دیا گیا اور نہ ہمہ اوست اور اوتار کے عقائد پیدا ہوئے۔

مسئلۂ نور و بشر

الحمدللہ اقسامِ شرک کے حوالے سے شرک کی پہلی قسم ''شرک فی الذات'' کی بحث مکمل ہو چکی ہے۔ ابھیں شرک کی دوسری قسم ''شرک فی الصفات'' کی بحث شروع کرنے سے پہلے میں ایک اہم علمی نکتے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک مسئلہ مذہبی بحث ونزاع کا موضوع بنا ہوا ہے۔ وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ''بشریت'' اور ''نور'' کا مسئلہ ہے کہ آپؐ بشر تھے یا نور۔ عوامی سطح پر جو مذہبی جلسے ہوتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر اسی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے' دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں جن میں جوش وخروش اور غیظ وغضب کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کی بشریت کی نفی اور نورانیت کے اثبات پر اور دوسرا گروہ آپؐ کی نورانیت کی نفی اور بشریت کے اثبات پر بہت زیادہ زور لگاتا ہے' جس سے مناظرے اور مباحثے کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ایک نزاع کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نزاع کا قطعاً کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس سلسلے میں محض کھینچ تان اور جوشیلی تقریروں کی وجہ سے بات بگڑتی ہے اور فریقین میں باہم شدت اور تلخی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ بشر نہیں تھے بلکہ نور تھے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپؐ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔ دونوں باتیں یکساں غلط ہیں' اصل حقیقت یہ ہے کہ آپؐ بیک وقت بشر بھی تھے اور نور بھی تھے۔ اور یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہے بلکہ میرا اور آپ کا اور ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان کے اندر اس کے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کا ''حیوانی'' وجود ہے۔ وہ خاکی الاصل ہے جو اِس زمین سے بنا ہے۔ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ظُلمانی ہے۔ اس میں تاریکی ہے' اس میں پستی کا رجحان ہے' اس میں برائی کا میلان ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ج اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ﴾ (یوسف: ۵۳) ''اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں' یقیناً نفس تو برائی پر اُبھارتا ہے''۔ لیکن انسان مجرد اِس پستی اور خاکی الاصل وجود ہی کا نام نہیں ہے' بلکہ اس کے وجود کا دوسرا حصہ ''روح'' ہے۔

نقطۂ	نوری	کہ	نامِ	او	خودی
زیرِ	خاکِ		ما	شرارِ	زندگی

انسانِ اوّل کو آدم علیہ السلام بنانے والی چیز یہی روحِ خداوندی تھی جو اُن میں پھونکی گئی۔ اور وہ روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے' بلکہ نورانی حقیقت رکھنے والی شے ہے۔ وہ ملائکہ کی ہم پلہ ہی نہیں ملائکہ کی مسجود ہے۔ ملائکہ نوری الاصل ہیں تو کیا روح خاکی الاصل ہے؟ نہیں' روح خاکی اور ظُلمانی نہیں ہے' بلکہ نورانی ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

ہے	ذوقِ	تجلّی	بھی	اِسی	خاک	میں	پنہاں
غافل		تو	نرا	صاحبِ	ادراک	نہیں	ہے!

حواسِ خمسہ یعنی دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا اور چھونا تو حیوانات میں بھی ہیں! انسان نے بھی اپنی حقیقت اگر یہی سمجھی تو اُس نے گویا اپنی اصل عظمت کو نہیں پہچانا۔ ادراک تو اصل میں اپنے سے باہر کی کسی شے کو محسوس کرنا ہے' جبکہ روشنی تو خود اپنا ظہور چاہتی ہے' اپنی تجلّی چاہتی ہے۔ تو انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کے دو حصے ہیں' ایک اس کا یہ حیوانی وجود ہے' جو خاکی الاصل ہے' ظُلمانی الاصل ہے۔ اس کا میلان پستی اور گناہ کی طرف ہے۔ اور ایک اس کا روحانی وجود ہے جو نورانی الاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا: ﴿فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (الحجر) ''پس جب میں اسے (آدم علیہ السلام کو) بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں''۔ یہاں روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔

تو یہ ہے ہمارا وہ نورانی عنصر جو ہر ایک انسان میں ہے۔ لیکن ع ''در حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی'' کے مصداق سب کا نور برابر تو نہیں ہے۔ کسی کا محض ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہے۔ کسی کی اس نورانیت پر اس کے نفس کی ظلمانیت اس طرح چھا گئی ہے کہ وہ نور معدوم کے درجے میں ہے۔ یعنی اس کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے' جبکہ کسی کا وہ نور اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی تمثیل یوں بیان کی ہے: ﴿یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط﴾ (النور: ۳۵) ''(کسی کی فطرت کا نور اتنا صاف اور شفاف ہے کہ) بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ روشنی پر روشنی ہے''۔ یہ ہے وہ نور جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں موجود تھا۔ ابھی وحی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا' لیکن

ان کے اندر اخلاقِ حسنیٰ کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ ایسے ہی تمام صدیقین اور انبیاء علیہم السلام کے اندر نورِ فطرت موجود ہوتا ہے۔ اب اس تناظر میں دیکھئے تو نبی اکرم ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ چونکہ بلندترین ہے تو آپؐ کی نورانیت بھی اتنی کامل ہے کہ اس نے خاکی وجود کی ظلمانیت کو بالکل معدوم کر دیا ہے۔ اس معنیٰ میں اگر کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نورِ مجسم ہیں تو غلط نہیں ہے۔

تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت صحیح ہیں۔ نبی اکرم ﷺ بیک وقت بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔ آپؐ کی بشریت کا کون انکار کرے گا! آپ ﷺ کی ولادت ہوئی ہے جیسے کسی انسان کی ولادت ہوتی ہے۔ آپؐ کے بھی وہی دو ہاتھ اور دو پاؤں تھے۔ وہی انسانی خون آپ کے وجود میں بھی سرایت کیے ہوئے تھا اور گردش کر رہا تھا۔ طائف میں آپؐ پر پتھراؤ ہوا ہے تو زخموں میں سے خون رِسا ہے۔ میدانِ اُحد میں جب تلوار کا وار آپؐ کے چہرۂ مبارک پر لگا ہے تو خون کا فوارہ چھوٹا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے شادی کی ہے اور آپؐ کے ہاں اولاد ہوئی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی نورانیت کی نفی ہرگز نہ کیجیے! آپؐ کی نورانیت کی نفی درحقیقت اِس دَور کا مادّہ پرستانہ فکر ہے جو میری آج کی بحث کا اصل موضوع ہے۔ ہم نے مادہ پرستانہ فکر اپنے ذہنوں پر اتنا مسلط کر لیا ہے کہ ہم روح کی حقیقت اور اس کے جداگانہ تشخص سے یا تو بالکلیہ منکر ہو گئے ہیں یا اس کا زبان پر ذکر لاتے ہوئے ہمیں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ بقول اکبرالٰہ آبادی: ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!

کہ روحانیت کی باتیں کرتے ہو؟ روح کی بات کرتے ہو؟ روح کو کوئی علیحدہ وجود مانتے ہو؟ تو یہ چیزیں ہمارے فکر اور نظریات کے دائرے سے اس طور سے باہر چلی گئی ہیں کہ اب ہم سمجھتے ہیں کہ انسان تو بس اسی حیوانی وجود کا نام ہے۔ ہم اپنے اس وجودِ حیوانی ہی کو اصل انسان سمجھے بیٹھے ہیں' اس لیے نورانیت کی نفی ہو رہی ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جو نورانی عنصر ہے' ایمان اور عمل صالح سے اس کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس گناہوں اور نفسانیت سے یہ نور بجھتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم میں دو جگہ میدانِ حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس دن اہل ایمان کی شان یہ ہوگی کہ:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾﴾ (الحدید)

''اُس دن آپ مؤمن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (اُن سے کہا جائے گا) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔''

آگے منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ﴾ (آیت ۱۳)

''اُس دن منافق مردوں اور عورتوں کا حال (جو دنیا میں چراغ گل کر کے جائیں گے) یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے استدعا کریں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو (ذرا ہمیں مہلت دو)' تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کریں۔ کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (اگر ہو سکتا ہے تو دنیا میں واپس جاؤ) اور اس نور کی تحصیل کر کے آؤ۔''

سورۃ التحریم میں ہے:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۸﴾﴾

''اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ: اے ہمارے ربّ! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس نور کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے دن کسی کا نور بس اتنا ہوگا کہ اس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی' اور کسی کا نور اِس قدر ہوگا کہ اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچے گی۔ یعنی اُس روز کسی کا نور بہت تھوڑا ہوگا کہ بس اس سے قدموں کے آگے آگے روشنی ہوگی۔ اور قیامت کے دن یہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا جس کو نصیب ہو گیا۔ اس لیے کہ اندھیرے میں ایک ٹارچ بھی بہت غنیمت ہوتی ہے جس سے آپ بالآخر منزلِ مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ جبکہ کسی کا نور اُس روز بہت زیادہ ہوگا جس سے ہر سو چراغاں ہو جائے گا۔ یہ حفظِ مراتب ہے۔ اس تناظر میں دیکھئے تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا نور کس قدر ہوگا! تو ان باتوں کو ذہن میں رکھیے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیک وقت ''بشر'' بھی ہیں اور ''نور'' بھی ہیں۔ اور یہی معاملہ ہم سب کا بھی ہے۔ ہمارا ایک روحانی وجود ہے جو نوری الاصل ہے اور ایک مادی وجود ہے جو خاکی الاصل ہے اور ہماری شخصیتوں میں ان دونوں کا امتزاج ہے۔ کسی کی ظلمانیت اس نور پر ایسے غالب آ گئی ہے کہ نور معدوم ہو گیا ہے اور کسی کی ظلمانیت پر اس کی نورانیت کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ اس کی ظلمانیت کافور ہو گئی ہے۔

اسی حقیقت کو حدیث نبویؐ کی روشنی میں اس طرح سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلاَّ وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ)) قَالُوْا : وَاِيَّاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((وَاِيَّايَ اِلاَّ اَنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلاَّ بِخَيْرٍ))

''تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ہمراہ ایک ساتھی شیطان نہ سونپ دیا گیا ہو''۔ صحابہ کرامؓ نے (بڑی ہمت کر کے) دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپؐ بھی؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں میں بھی' مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی تو میں نے اسے مسلمان بنالیا۔ اب وہ مجھے سوائے بھلائی کے کوئی اور مشورہ نہیں دیتا۔''

یہ رسول اللہ ﷺ کا بات کو سمجھانے کا ایک انداز تھا۔ بہرحال وہ نفس تھا تو سہی رسول اللہ ﷺ کے اندر بھی۔ آپؐ کا بطنِ مبارک بھی کھانے کو مانگتا تھا۔ بھوک کا احساس محمد ﷺ کو بھی ہوتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے آپؐ پر بھی نقاہت طاری ہوتی تھی۔ طائف میں پتھراؤ کی وجہ سے جب بہت زیادہ خون بہا تو آپؐ پر نقاہت طاری ہوئی اور آپؐ بیٹھ گئے۔ اسی طرح اُحد میں بھی بہت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے آپؐ پر نقاہت طاری ہوئی اور آپؐ بے ہوش ہو گئے۔ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس لیے کہ انسانی عواطف ومیلانات اور احساسات وجذبات آپؐ کی شخصیت میں بتمام وکمال موجود تھے۔ لیکن ان چیزوں کی وجہ سے کبھی آپ ﷺ سے (معاذ اللہ) خدا کی معصیت کا صدور ممکن نہیں ہوا۔ آپؐ کو تمام بشری تقاضوں اور آثارِ طبعی پر اس قدر قابو تھا کہ کوئی بھی چیز آپؐ سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرا سکی۔

مسلمانوں میں اَوتار کا تصور

گزشتہ نشست میں مَیں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوؤں کے ہاں نو اَوتار تھے' ایک دسواں اَوتار اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں نے اُن میں شامل کر لیا ہے۔ اب اس بات کی ذرا تفصیل جان لیجیے! دراصل شیعیت کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ہمارے ہاں جو معروف شیعہ ہیں وہ ''اثنا عشری'' ہیں' یعنی پہلے بارہ اماموں کے ماننے والے۔ ان کے خیال میں بارہویں امام غائب ہو گئے جو امامِ منتظَر کہلاتے ہیں اور وہ اُن کے انتظار میں ہیں کہ وہ دوبارہ آئیں گے۔ چھٹے امام پر ایک شاخ علیحدہ ہو گئی جو ''شش امامیہ'' کہلاتے ہیں۔ یعنی پہلے چھ امام تو ''اثنا عشری'' اور ''شش امامیہ'' کے مابین مشترک ہیں' لیکن اسماعیل' جو امام جعفر صادقؒ کے بڑے صاحبزادے تھے' ان سے اِن شش امامیہ والوں کی شاخ الگ ہو گئی۔ شش امامیہ والوں کی بھی آگے چل کر دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک شاخ وہ ہے جو ہمارے ہاں ''بوہرے'' کہلاتے ہیں۔ ان کے غالباً ۲۲ویں امام غائب ہو گئے۔ طاہر سیف الدین' جن کا انتقال ہو گیا' اور برہان الدین جو بمبئی میں رہتے ہیں' ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ یہ امام نہیں کہلاتے بلکہ داعی کہلاتے ہیں۔ شش امامیہ کی دوسری شاخ ''اسماعیلی'' ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق ان کے امام غائب نہیں ہوئے' بلکہ امامت کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ اِس وقت پرنس کریم آغا خان ان کے امامِ حاضر ہیں۔ یہ امام کو معصوم مانتے ہیں۔

پیر شمس الدین سبزواری (۱) اور دیگر اسماعیلی مبلغین کے ذریعے اسماعیلیت کی دعوت جب ہندوستان میں دی گئی تو ان مبلغین نے دعوت وتبلیغ کے لیے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ چونکہ ہندوؤں کو مسلمان بنانا آسان کام نہیں' لہٰذا ان کے عقیدوں کے ساتھ ہی ذرا اپنے عقیدے کو جوڑ و تو بات بن جائے گی۔ ہندو نو اَوتار مانتے تھے' انہوں نے یہ کہا کہ نو اَوتار تمہارے ہیں اور دسواں اَوتار ایک اور آیا ہے اور وہ حضرت علی ؓ ہیں۔ اس مذہب میں ''دشم اَوتار'' یعنی دسواں اَوتار حضرت علی ؓ کو مانا جاتا ہے۔ اَوتار یا Incarnation کا یہ عقیدہ باضابطہ طور پر ان کے عقائد میں شامل ہے۔

دوسرا کام ان مبلغین نے یہ کیا کہ ہندوستان میں نئے ایمان لانے والوں پر سے شریعت ساقط کر دی۔ ظاہر بات ہے اگر کسی کو اسلام یا دین کی تعلیم دی جائے اور اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ پانچ نمازیں بھی پڑھنی پڑیں گی' تیس روزے بھی رکھنے پڑیں گے' تو وہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے دس دفعہ خوب سوچے گا۔ لیکن اگر اسے یہ کہا جائے کہ کوئی شریعت تم پر لاگو نہیں ہو گی' بس تم کلمہ پڑھ لو' تو اس کے لیے اب کام آسان ہو جائے گا۔ جیسے سینٹ پال نے کہا تھا کہ بس حضرت مسیح (علیہ السلام) کو مان لو تو تمہارے گناہوں کی طرف سے وہ پیشگی کفارہ ہو جائیں گے' تمہارے اوپر شریعت کا بھی بوجھ نہیں ہو گا اور حلال وحرام کی قید بھی نہیں ہو گی' چاہے خنزیر کھاؤ اور شراب پیو۔ چنانچہ ان کے ہاں پہلے سے جو مشرکانہ عقائد تھے ان پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنی تثلیث بنالی اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اس عقیدے سے اپنے مذہب کو جوڑ دیا۔ تو اس طرح سے سینٹ پال والی عیسائیت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بعینہٖ یہی کام ہندوستان میں اسماعیلی داعیوں نے کیا کہ شریعت ساقط قرار دے دی۔ لہٰذا ہمارے آغا خانیوں کے ہاں نماز روزہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ ان کی مسجدیں نہیں ہوتیں' محض جماعت خانے ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت کلبوں اور چوپال کی ہے جہاں وہ آ کر بیٹھتے ہیں اور ساتھ مل کر کھانا وغیرہ کھاتے ہیں۔ جماعت خانہ ان کی سوشل لائف کا ایک مرکز ہے۔ باقی یہ کہ شریعت اُن سے ساقط ہے۔ البتہ ہمارے شمالی علاقے ہنزہ اور چترال میں جو اسماعیلی آباد ہیں' ان کے ہاں شریعت موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ local converts نہیں ہیں' بلکہ وہ ایران سے آئے تھے۔ جبکہ بمبئی اور کاٹھیاواڑ وغیرہ کے علاقے میں مقامی لوگوں نے جو اسماعیلیت قبول کی ہے اس میں ایک تو شریعت ساقط ہے اور دوسرے حضرت علی ؓ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے دسویں اَوتار ہیں۔ ہندوستان میں نو اَوتار پہلے سے پوجے جا رہے تھے' پھر دسواں اَوتار حضرت علی ؓ کو منوا کر اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔